ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار*

پنجاب کا سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی ماحول

(عہد انگلیسی - وکٹورین دور)

الحاق پنجاب (مارچ ۱۸۴۹ء) سے اس خطے میں سیاسی، انتظامی اور معاشی تبدیلیوں کا ایک نیا دور شروع ہوا - ۱۸۵۷ء کا انقلاب برصغیر کی سیاسی و تمدنی تاریخ کا ایک فیصلہ کن موڑ تھا لیکن پنجاب میں نئے دور کا آغاز آٹھ سال قبل ۱۸۴۹ء سے ہو چکا تھا - ہمارے نزدیک برصغیر اور پنجاب میں اس فرق کے کچھ معقول اسباب ہیں جنھیں سمجھے بغیر نہ اس تبدیلی کو پوری طرح محسوس کیا جا سکتا ہے اور نہ پنجاب کے آئندہ حالات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے - ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ واقعات کے سلسلے میں چند اہم تبدیلیوں کا یہاں ذکر کر دیا جائے -

پنجاب ۱۷۵۶ء تک مغلیہ سلطنت کا حصہ تھا اور یہاں کا صوبیدار بادشاہ دہلی کی طرف سے نظم و نسق کا ذمے دار تھا - دہلی پر احمد شاہ ابدالی کی یلغار (۱۷۵۶ء) کے بعد پنجاب ابدالی کی سلطنت کا حصہ بن گیا اور یہاں کے صوبیدار کا تقرر شاہ کابل کی طرف سے ہونے لگا - چنانچہ اسی سال لاہور کا پہلا افغان گورنر احمد شاہ ابدالی کا بیٹا تیمور خاں مقرر ہوا - لیکن تیمور خاں اور بعد کے افغان گورنر (بلند خان، کابلی مل وغیرہ) سکھوں کو دبانے، امن و امان قائم رکھنے اور نظم و نسق بحال کرنے میں ناکام رہے - حتیٰ کہ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری جنگ میں مرہٹوں کی طاقت کو کچل دیا اور اس سے اگلے برس ستلج پار کرکے لدھیانہ کے قریب کوٹ راہیرہ کے مقام پر سکھوں کو تباہ کن شکست دی - لیکن نہ تو پانی پت کی فیصلہ کن جنگ کے بعد اس نے دہلی کو اپنی حکومت کا مستقر بنایا اور برصغیر کے سیاسی و انتظامی خلا کو دور کرنے کی کوشش کی، اور نہ کوٹ راہیرہ ہی میں سکھوں کو عبرت ناک شکست دینے کے بعد پنجاب کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کی فکر کی - حریفوں کو خاک و خون میں ملانے اور مال غنیمت سمیٹنے کے بعد ہر بار اس نے کابل کا رخ کیا اور اسی روایت پر اس کے جانشین عمل پیرا رہے - نتیجہ یہ ہوا کہ

---

* ایسوسی ایٹ پروفیسر پنجاب یونیورسٹی -

پنجاب پر عملاً جنگجو اور تندخو سکھوں کا قبضہ ہوگیا اور ان کی مختلف مثلوں نے پنجاب کے مختلف حصوں پر اپنی اپنی بالادستی قائم کرکے لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ پنجاب کے عام مسلمان خصوصاً ان کے ظلم و انتقام کا نشانہ بنے۔ ان مظلوموں کے تحفظ کی ذمے دار نہ دلی کی حکومت تھی اور نہ کابل کی حکومت اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہو سکی۔ مغلیہ عہد کا خوشحال پنجاب اس دور میں ایسا بدحال ہوا کہ اس پر آنسو بہانے والا بھی کوئی نہ رہا۔ ۱۷۹۸ء میں شاہ زمان والی کابل آخری بار خراج وصول کرنے لاہور آیا اور واپسی پر دریائے جہلم سے بھاری توپیں گزارنے کے صلے میں لاہور کی حکومت کا پروانہ رنجیت سنگھ کو دے گیا جس نے ۱۷۹۹ء میں لاہور پر قبضہ کر کے ستلج اور اٹک کے درمیان اپنی حکومت قائم کرلی اور ۱۸۰۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے معاہدہ امرتسر کرکے پنجاب اور سرحد پر ایک خود مختار حکمران کے طور پر اپنی وفات (۱۸۳۹ء) تک حکومت کرتا رہا۔ رنجیت سنگھ کے جانشینوں کی باہمی کشمکش اور خالصہ فوج کی خود سری کی وجہ سے دس سال کے اندر سکھ راج کا خاتمہ ہوا اور پنجاب کا الحاق ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات سے ہوگیا جو پلاسی (۱۷۵۷ء) اور بکسر (۱۷۶۴ء) کی جنگوں کے بعد، جنوب میں ٹیپو سلطان اور وسطی ہند میں مرہٹوں وغیرہ کی قوت مزاحمت کو ختم کرکے بتدریج شمال میں ستلج تک پھیل چکے تھے۔

ان واقعات پر طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ سب سے آخر میں ہوا، اور اس قبضے کی روداد برصغیر کے دوسرے علاقوں پر قبضے سے خاصی مختلف تھی۔ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ۱۷۵۶ء سے ۱۷۹۹ء تک پنجاب بظاہر کابل کے ماتحت ایک صوبہ تھا لیکن عملاً یہاں سکھ گردی کے تحت خوف و دہشت کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ ۱۷۹۹ء سے ۱۸۴۹ء تک پچاس سال یہاں رنجیت سنگھ اور اس کے جانشین حکمران رہے۔ پنجاب اور سرحد کے لیے یہ سکھا شاہی اگرچہ سکھ گردی کے مقابلے میں نسبتاً عافیت کا دور تھا، تاہم یہاں کے مسلمانوں کے لیے پہلی اذیت (سکھ گردی) کے مقابلے میں یہ عافیت (سکھا شاہی) بھی جبر و استبداد ہی کی قدرے معتدل صورت تھی، کیونکہ اس میں نہ کوئی قانون تھا نہ ضابطہ، نہ داد تھی نہ فریاد، بس ایک مسلح مذہبی گروہ کا راج تھا جو دوسروں کو عزت و آبرو سے جینے کا حق دینے کو تیار نہ تھا:

> "Every sikh enjoyed all the privileges of khalsa citizenship —exemption from taxation, liberty to oppress, and opportunity to live like a freebooter. His (Ranjit Singh's) rule was a tyranny of force. He had no system, no conception of duty

to his subjects : he and his people gloried in their ignorance : in his time there were no law courts, no schools, no jails in the Punjab : the only punishments known were fines for the rich, and mutilation—the lopping off of arm or leg—for the poor; until well into the sixties maimed specimens of his inhumanity were seen in every town and large village of the Punjab."[1]

ان حالات میں جبکہ مسلمان تقریباً ایک صدی سے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے تھے اور رنجیت سنگھ کے بعد کی لاقانونیت نے تو ہندو اور سکھ عوام کے لیے بھی مصائب پیدا کر دیے تھے ، پنجاب میں انگریزی حکومت کا قیام ایک طویل عرصے کی جھلسا دینے والی گرم لو کے بعد برکھا رت آنے کے برابر تھا ۔ اس تبدیلی پر یہاں کے عوام نے اطمینان کا سانس لیا اور زندگی کی تعمیر نو میں مصروف ہو گئے ۔

انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں نظم و نسق کے قیام اور امن و امان کی بحالی پر خصوصی توجہ مبذول کی ، اور یہی اس وقت اس خطے کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ ان قلعوں اور گڑھیوں کو مسمار کر دیا گیا جو سکھوں نے جگہ جگہ اپنی کمین گاہوں کے طور پر بنا رکھی تھیں ۔ صرف وہ قلعے باقی رہنے دیے گئے جو دفاعی لحاظ سے کمپنی کی سپاہ کے لیے ضروری تھے۔ لوگوں سے ہتھیار لے لیے گئے اور آئندہ اسلحہ رکھنے کے لیے اجازت نامہ (لائسنس) ضروری قرار دیا گیا ۔ گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب کے نظم و نسق پر خاص توجہ دی ۔ ایک انتظامی بورڈ قائم کیا گیا جس میں سول سروس کے تین لائق انگریز افسروں (ہنری لارنس ، جان لارنس ، چارلس منسل) کو شامل کیا گیا اور ان کے ذمے علی الترتیب سیاسی ، مالی اور عدالتی امور کیے گئے ۔ بورڈ کے ماتحت پنجاب و سرحد کو سات کمشنریوں اور ستائیس اضلاع میں تقسیم کر کے یہاں انگریز کمشنر اور ڈپٹی کمشنر مقرر کیے گئے جن کے ماتحت یورپین اسسٹنٹ کمشنر اور دیسی ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر کیے گئے ۔ پھر اضلاع کو تحصیلوں اور ذیلوں میں تقسیم کر کے مالیہ کی فراہمی اور اراضی کا بندوبست کیا گیا ۔ نیز پولیس کے حلقے (تھانے) قائم کرکے جرائم کے انسداد پر توجہ کی گئی ۔ تین سال کے قلیل عرصے میں ان اصلاحات کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے اور اس خطے کی زندگی معمول پر آ گئی ۔ مارچ ۱۸۵۲ء میں انتظامی بورڈ نے لارڈ ڈلہوزی کو رپورٹ بھیجتے ہوئے عام صورت حال کے بارے میں لکھا :

"All violant crimes have been repressed, all gangs of murderers and robbers have been broken up, and the ringleaders brought

1. S. S. Thorburn, *The Punjab in Peace And War*, Page, 23.

to justice. In no part of India is there now more perfect peace than in the territories lately annexed."[1]

پنجاب کی اس وقت کی صورت حال کا یہ نقشہ بالکل صحیح ہے - ۱۸۵۳ء میں انتظامی بورڈ موقوف کر دیا گیا اور پنجاب میں چیف کمشنری قائم کرکے سرجان لارنس کو یہاں کا پہلا چیف کمشنر مقرر کیا گیا ۔ اس کے ماتحت ایک فنانشل کمشنر اور ایک جوڈیشل کمشنر مقرر ہوئے ۔ سات آٹھ سال کے عرصے میں پنجاب میں نظم و نسق قائم کرنے کے علاوہ تعمیر و ترقی کے بہت سے کاموں کا آغاز و انصرام ہوا ۔ مغل دور کی قدیم نہر ہنسلی (جو سکھ دور میں معدوم ہوگئی تھی) کے نقش قدم پر دریائے راوی سے مادھو پور کے مقام سے نہر باری دوآب کی کھدائی کا کام ۱۸۵۱ء میں شروع ہوا، اور اس نہر میں ۱۸۵۹ء میں پانی چھوڑا گیا - ۱۸۵۹ء ہی میں لاہور اور امرتسر کے درمیان اولین ریلوے لائن بچھائی گئی - شاہراہوں کی تعمیر کا سلسلہ بھی اسی زمانے میں شروع ہوا - سب سے پہلے قدیم جرنیلی سڑک کے نقش قدم پر پشاور سے لاہور تک سڑک بنائی گئی اور پھر اسے دوسرے حصوں سے ملایا گیا ۔ صوبے کے مختلف شہروں اور قصبوں میں مدرسے، شفاخانے ، ڈاک خانے قائم کیے گئے ۔ جرائم کے انسداد کے لیے پولیس اور ملٹری پولیس (فرنٹیئر فورس) قائم کی گئیں ۔ مالگذاری کا بندوبست کرنے کے علاوہ پنجاب کے رسم و رواج اور مختلف مذاہب کے مطابق مجموعہ قوانین دیوانی منضبط کیا گیا ۔ ان تعمیری کاموں کی وجہ سے پنجاب کی شہری و دیہاتی زندگی میں طویل عرصے کی بدانتظامی اور انتشار کے بعد سکون و اطمینان پیدا ہوا ۔ نہ صرف مسلمانوں کو سکھوں کے جور و استبداد سے نجات ملی بلکہ خود ہندوؤں اور سکھوں کو بھی پر امن حالات میں اپنے اپنے پیشوں میں کام کرنے کا موقع ملا ۔ اس امر کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ سکھ قوم جو چند برس پہلے پنجاب کی مالک و مختار تھی اور صرف دو تین سال قبل چیلیانوالہ اور گجرات کے خونریز معرکوں میں انگریزوں کا مقابلہ کرتے ہوئے خاک و خون میں لوٹی تھی ، نئے نظام سے اتنی مانوس و مطمئن ہوگئی کہ الحاق کے تین سال بعد (۱۸۵۲ء میں) برما کی دوسری لڑائی میں اور پھر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے دوش بدوش جنگ آزادی کے سپاہیوں کے خلاف معرکہ آرا ہوئی - خصوصاً ۱۸۵۷ء کے معرکۂ انقلاب میں تو پنجاب انگریزوں کے لیے نہ صرف ایک محفوظ قلعہ ثابت ہوا بلکہ اس نازک موقع پر ان کے جنگی اقدامات کے لیے ممد و معاون بنا ۔ پٹیالہ ، نابھہ ، جیند ، فرید کوٹ کے سکھ راجاؤں کے علاوہ پنجاب کے سکھوں نے دل کھول کر اس آزمائش میں انگریزوں کی جانی و مالی امداد کی ۔ کچھ مسلمان

1. S. S. Thorburn, *The Punjab in Peace And War*, P. 164.

زمینداروں نے بھی انگریزوں سے تعاون کیا ۔ ملتان اور ساہیوال کے بعض قبائل نے انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے لیکن وہ کسی مرکزی نظام سے مربوط نہیں تھے ۔ پنجاب میں مقیم دیسی سپاہ نے (جو زیادہ تر مدراسی ، بنگالی اور پوربی تھے) جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ کچھ لڑتے لڑتے کام آئے اور کچھ دہلی کی طرف نکل گئے۔ بعض دیسی رجمنٹوں سے حفظ ماتقدم کے طور پر بروقت ہتھیار لے لیے گئے ۔ مجموعی طور پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ الحاق کے بعد پنجاب میں انگریزوں کی انتظامی اور تعمیری حکمت عملی کی وجہ سے یہاں کے عام لوگوں نے انقلاب ۱۸۵۷ء میں کچھ زیادہ دلچسپی نہ لی اور مفتوح سکھوں نے تو بڑھ چڑھ کر انگریزوں کی مدد کی ۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے اسباب کا تجزیہ اور واقعات کا سلسلہ ہمارے موجودہ موضوع سے کچھ زیادہ تعلق نہیں رکھتا ۔ کیونکہ پنجاب مذکورہ بالا حالات کے تحت برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دائرۂ استحصال سے باہر اور سکھوں کے جور و استبداد کا شکار رہا ۔ اس لیے پانی پت کی تیسری جنگ (۱۷۶۱ء) سے لے کر ۱۸۵۷ء تک برصغیر کے دوسرے علاقے جن سیاسی ، معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں سے دوچار ہوئے ، پنجاب ان سے براہ راست متاثر نہیں تھا ۔ لہٰذا واقعات انقلاب کے اصل مراکز بھی پنجاب سے باہر تھے۔ تاہم پنجاب اس انقلاب عظیم سے بالکل بیگانہ بھی نہیں رہا اور ۱۸۵۷ء کے بعد پنجاب اور برصغیر کے دوسرے علاقوں کا سیاسی مستقبل تاج برطانیہ کے سائے میں یکساں ہوگیا ۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی بلاشبہ ایک استعماری طاقت کے سیاسی، معاشی ، تہذیبی اور مذہبی استحصال کے خلاف لڑی گئی تھی ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی یورپ کی دوسری تجارتی کمپنیوں کی طرح اس ملک میں تجارت کی غرض سے آئی تھی ۔ مغلیہ سلطنت کے زوال و انتشار کے بعد حالات کو سازگار پا کر رفتہ رفتہ ملک کے بڑے حصے پر قابض ہوگئی ۔ یہ ایک ایسی استعماری طاقت تھی جو اس ملک کو محکوم بنا کر یہاں کے زرعی و معدنی وسائل کی لوٹ کھسوٹ اور ملکی باشندوں کے اقتصادی استحصال سے اپنے ملک انگلستان کی ترقی و خوشحالی کا سامان فراہم کر رہی تھی ۔ برصغیر کے لیے یہ ایک بالکل نئی صورت حال تھی جو اس سے قبل کسی حکمران سلسلے نے ، خواہ وہ وسط ایشیا سے آیا ہو یا خراسان و افغانستان سے، نہیں دکھائی تھی ۔ کمپنی کی حکومت کے بظاہر کچھ فوائد بھی اس ملک کو پہنچے ۔ مغلیہ سلطنت کے زوال سے ملک میں جو بدامنی و انتشار پھیلا تھا ، کمپنی کے نظم و نسق نے اس کا مداوا کر دیا اور امن و امان قائم کرکے تعلیمی و معاشرتی اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا ۔ لیکن اجنبی راج کے تحت جو سیاسی ، معاشی ، معاشرتی اور تعلیمی تبدیلیاں آ رہی تھیں اور حاکم و محکوم کا جو تفاوت قدم قدم پر زندگی کے مختلف

شعبوں (سول انتظامی شعبوں سے لے کر فوج تک) میں ظاہر ہو رہا تھا اس سے مقامی باشندوں میں بے چینی اور بے اطمینانی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر کمپنی کے پر جوش مسیحی ملازم سول میں ہوں یا فوج میں ، مقامی باشندوں کو عیسائی بنا کر یہاں ایک مسیحی سلطنت کے قیام کے خواب بھی دیکھ رہے تھے۔ مشریوں کے راہب اور پادری سر عام وعظ کرکے دوسرے ادیان کے بارے میں تعصب و نفرت کی فضا پیدا کر رہے تھے۔ مقامی باشندوں میں اس کا ردعمل قدرتی امر تھا۔ اس بے چینی و بے اطمینانی کے لاوے نے پک کر ۱۸۵۷ء کے آتش فشاں کی صورت اختیار کرلی۔ جب یہ جوالا مکھی پھٹا تو اس نے شمالی ہند کی زندگی کو تہس نہس کرکے رکھ دیا۔ جنگ آزادی میں ملکی باشندوں کی ناکامی کے بعد انگریزی اقتدار پورے طور سے برصغیر پر مسلط ہوگیا اور کم از کم آئندہ نصف صدی تک ملک میں کوئی ایسی سیاسی قوت باقی نہ رہی جو اس کے سامنے دم مار سکے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کچھ عرصے تک انتقام کی تیغ بے نیام چلتی رہی۔ پھر معمولی سی اصلاحات کا دور شروع ہوا۔ نئی تعلیمی ، معاشی ، معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا ، ان کا خیر مقدم پنجاب سمیت برصغیر کے سب علاقے کر رہے تھے۔ کچھ قدیم وضع کے لوگ ان تبدیلیوں کو شک کی نظر سے بھی دیکھ رہے تھے۔

نومبر ۱۸۵۸ء کے اعلان کے مطابق ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور حکومت ختم ہو گیا اور برصغیر براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت آ گیا۔ برائے نام مغل بادشاہت کا چراغ گل ہوگیا اور دہلی کی تصوراتی حیثیت بھی ختم ہو گئی۔ سقوط دہلی کے بعد وہاں سے اکثر مسلمانوں کو نکال دیا گیا تھا۔ بعد میں دہلی و حصار کے علاقے بھی پنجاب میں شامل کر دیے گئے۔ کلکتہ برصغیر کا مرکز حکومت بنا۔ پنجاب میں ۱۸۵۹ء میں لیفٹننٹ گورنری قائم ہوئی اور سر جان لارنس کو یہاں کا پہلا لیفٹننٹ گورنر مقرر کیا گیا۔

جن تاریخی عوامل کے تحت برصغیر میں انگریزی اقتدار قائم ہوا ، ان میں یہ حقیقت کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ اس سے قبل یہاں مسلمان بر سر اقتدار تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو مسند اقتدار تک پہنچنے کے لیے جن طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا ان میں اپنی حریف و رقیب فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاوہ جنوب میں نوابان کرناٹک ، میسور کے سلاطین حیدر علی و فتح علی ٹیپو اور بنگال میں سراج الدولہ ، میر قاسم اور ان کے بعد اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی تھے۔ اگرچہ بعد میں مرہٹوں ، سکھوں وغیرہ سے بھی کمپنی کی معرکہ آرائیاں ہوئیں لیکن برصغیر کا اقتدار بنیادی طور پر مسلمانوں سے انگریزوں

کو منتقل ہوا ۔ اس حقیقت کو انگریز بھی جانتے تھے اور مسلمان بھی محسوس کرتے تھے ۔ اسی حقیقت کے پیش نظر انگریزوں کو اپنے اقتدار کے استحکام کے لیے یہ حکمت عملی اختیار کرنی پڑی کہ برصغیر میں مسلمانوں کے مقابلے میں یہاں کی غیر مسلم اقوام خصوصاً ہندوؤں کا تعاون حاصل کریں جو آبادی کے لحاظ سے اکثریت میں تھے ۔ چنانچہ سب سے پہلے بنگال میں یہ حکمت عملی اختیار کی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ مسلم قوم جو کل تک یہاں حاکم تھی ، نان شبینہ کی محتاج ہو گئی ۔ ہندو قوم نے اس تبدیلی اقتدار کو حسب منشا پاکر انگریزوں سے بھرپور تعاون کیا اور ان کے گماشتے کے طور پر اقتصادی وسائل پر قابض ہو گئی[1] انگریز اور ہندو دونوں قوموں کا یہ سنجوگ ایک تاریخی ضرورت کے تحت ہوا تھا ۔ انگریزوں کو اپنے استعماری مقاصد کی تکمیل کے لیے مقامی باشندوں کے تعاون کی ضرورت تھی اور ہندو صدیوں کی محکومی کے بعد مسلم اقتدار کے نشانات کو انگریزی سنگینوں کی مدد سے مٹا کر پراچین ہندو تہذیب کے احیاء کے خواب دیکھ رہا تھا (راجہ رام موہن رائے کی معتدل معاشرتی تحریک میں بھی یہ جذبہ کارفرما تھا ، بنکم چندر چیٹرجی بھی اسی رجحان کے نمائندے تھے اور انتہا پسند ہندو رہنما دیانند سرسوتی ، ویوکا نند ، آشوتوش، بال گنگا دھرتلک اور مدن موہن مالوی تو واشگاف طور پر اپنے اسلام دشمن جذبات کا اظہار کرنے لگے تھے) بہرکیف انگریز اور ہندو کا یہ تاریخی سنجوگ جس کی ابتدا بنگال سے ہوئی آئندہ کے لیے برطانوی سیاست کا سنگ بنیاد بن گیا ۔ ہر چند کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں مسلمانوں کے دوش بدوش ہندوؤں نے بھی حصہ لیا تھا لیکن ناکامی کے بعد ہدف انتقام صرف مسلمان بنے ۔ انگریزوں نے اپنی مخصوص حکمت عملی کے مطابق ہندوؤں کو نوازنے کا سلسلہ جاری رکھا اور سرکاری ملازمتوں کے علاوہ ساہوکار ، مہاجن اور گماشتے کے طور پر انھیں اقتصادی میدان میں کھلا چھوڑ دیا ۔ ان کا یہ کاروبار بنگال سے چل کر پنجاب ، سرحد ، سندھ اور بلوچستان تک پھیل گیا ۔ برصغیر کی آئندہ سیاست انگریزوں کے اختیار کردہ اسی بنیادی اصول پر گردش کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے ۔ صرف حالات کے تحت اس میں جزوی تبدیلی وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ۔

ہندو ، مسلم تفاوت کا یہ سلسلہ سیاست اور اقتصاد کے بعد واضح طور پر زبان کے مسئلے میں ظاہر ہوا ۔ انگریزوں کو ورثے میں جو دفتری نظام ملا اس کی سرکاری زبان فارسی تھی ۔ مغلیہ عہد میں ہندو کائستھ فارسی زبان اور دفتری امور کے ماہر

۱۔ ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے اپنی رپورٹ Our Indian Musalmans مطبوعہ ۱۸۷۱ء میں تفصیل سے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے ۔

سمجھے جاتے تھے ۔ انگریزوں نے شروع میں اس دفتری روایت کو جاری رکھا ، پھر اپنی استعماری حکمت کے تحت دفتروں میں فارسی کے بجائے ''ہندستانی'' (اردو) کو رائج کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کے لیے تیاری کا مرحلہ فورٹ ولیم کالج میں طے کیا گیا ۔ تیاری کے اس مرحلے میں بھی حکمت یہ اختیار کی گئی کہ ایک ہی زبان کے دو رسم الخط اور ہندو مسلم معاشرتی زندگی کے متعلق مختلف ذخیرۂ لفظی کے جداگانہ استعمال سے اردو اور ہندی دو زبانوں کی بنیاد فراہم کی گئی ۔ ورنہ خود انگریزوں میں اس وقت تک اردو اور ہندی تو ایک ہی زبان ''ہندستانی'' کے مختلف نام سمجھے جاتے تھے جو اس زمانے تک مسلمانوں اور ہندوؤں کے صدیوں کے میل جول کا نتیجہ اور مشترکہ میراث خیال کی جاتی تھی ۔ آگے چل کر رفتہ رفتہ اردو مسلمانوں کی اور ہندی ہندوؤں کی زبان کے طور پر نشو و نما پانے لگیں ۔ ہندو عصبیت نے جوں جوں اپنا رنگ دکھانا اور گزشتہ ادوار کے تہذیبی نقوش کو اپنے لوح دل سے مٹانا شروع کیا ، یہ فاصلے بڑھتے گئے اور نفاق زیادہ ہوتا گیا ۔ ۱۸۳۴ء میں اردو کو فارسی کی جگہ دفتری زبان قرار دیا گیا ۔ جب ۱۸۴۹ء میں پنجاب کا الحاق ہوا تو یہاں بھی فارسی کی جگہ اردو دفتری زبان بن گئی (سکھوں کے عہد میں بھی یہاں کی دفتری زبان فارسی تھی)۔ اس وقت تک برصغیر میں زبان کا کوئی مسئلہ سوائے اس کے پیدا نہیں ہوا تھا کہ ۱۸۳۵ء میں میکالے تعلیمی کمیشن نے صرف صدارتی ووٹ کی کثرت سے اردو کی بجائے انگریزی ذریعہ تعلیم کی سفارش کر دی تھی ۔ میکالے کے نزدیک مستقبل کی استعماری ضرورتوں کی خاطر انگریزی کی یہ بالادستی ضروری تھی جس کا اظہار اس نے بغیر کسی ملمع سازی کے یوں کر دیا تھا :

> "We must at present do our best to form a class who may be interpreters between us and the millions whom we govern ; a class of persons, Indian in blood and colour, but English in taste, in opinions, in morals and in intellect."

زبان کے مسئلے نے سب سے پہلے یو۔پی اور بہار میں سر اٹھایا ۔ بعض انگریز افسروں کی ایما پر کچھ ہندو تنظیموں نے مطالبہ شروع کیا کہ دفتروں اور عدالتوں میں ہندی بخط دیوناگری رائج کی جائے ۔ ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں نے بنارس میں اس تحریک کا آغاز کیا اور پھر مختلف شہروں میں اس کی شاخیں قائم کرکے حکومت کو درخواستیں بھیجنی شروع کیں ۔ اس کا ردعمل مسلمانوں میں بھی ہوا ۔ سید احمد خاں جو رسالہ' اسباب بغاوت ہند لکھ کر برصغیر کے ایک سیاسی رہنما کے طور پر ابھرے تھے ، ہندوؤں کے اس طرز عمل سے بہت مایوس ہوئے اور انہیں یقین ہوگیا

---

1. Macaulay, T. B. *Minutes on Education in India*, Ed. 1862, Page, 115.

کہ اب اس ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا یکجا ہوکر کام کرنا محال ہوگا ۔ اس واقعہ پر وہ اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :

''انہیں دنوں جبکہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ، ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے ، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا ۔ وہ متعجب ہوکر میری گفتگو سن رہے تھے ۔ آخر انہوں نے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے ۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے ۔ میں نے کہا ، اب مجھ کو یقین ہوگیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی ۔ ابھی تو بہت کم ہے ، آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں ، بڑھتا نظر آتا ہے ۔ جو زندہ رہے گا ، وہ دیکھے گا''۔۱

۱۸۸۱ء کے تعلیمی کمیشن کے سامنے ہندوؤں نے ہندی کے مسئلے کو بڑی شدت سے اٹھایا اور اس صدی کے اختتام پر یو۔پی کے لیفٹننٹ گورنر سر انطونی میکڈونل کی سرپرستی میں ہندو اس صوبے میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے ۔ اس صورت حال سے ہندو مسلمانوں میں بڑی تلخی پیدا ہوگئی ۔ اردو ، ہندی کا یہ لسانی تنازع اگرچہ پنجاب کے لیے بے معنی تھا ۔ کیونکہ الحاق پنجاب کے بعد اردو دفتری اور ابتدائی درجوں میں تعلیمی زبان بنی تو یہاں کی جملہ اقوام (ہندو ، مسلمان ، سکھ) کے لیے اس میں کوئی دشواری یا مغائرت نہ تھی اور بعد میں بھی ایک عرصے تک عملاً یہاں اردو ہی تحریر و تقریر اور تعلیم و صحافت کی زبان رہی ۔ لیکن ہندو عصبیت نے ہر جگہ ہندی کے مطالبے کو اپنا قومی شعار بنا لیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ پنجاب میں یہ مطالبہ بھی اردو میں کیا جاتا تھا ۔ پھر پنجاب میں یہ لسانی مسئلہ صرف اردو اور ہندی تک محدود نہ رہا بلکہ سکھوں نے گورمکھی رسم الخط کے ساتھ پنجابی کو اپنی قومی زبان قرار دے کر اسے سہ لسانی مسئلہ بنا دیا جس نے یہاں ہندو، مسلم اور سکھ اقوام کی جداگانہ سیاسی حیثیت کو متعین کرنے میں بڑا حصہ لیا ۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں پنجاب (سرحد سمیت) رقبے کے لحاظ سے برصغیر کا سب سے بڑا صوبہ تھا جو آخر میں برطانوی سلطنت کا حصہ بنا ۔ ۳۱ دسمبر ۱۸۵۴ء کو پنجاب کی پہلی مردم شماری ہوئی جس کے مطابق یہاں کی کل آبادی تیرہ ملین (ایک کروڑ تیس لاکھ) تھی ۔ اس میں ساڑھے سات ملین مسلمان اور ساڑھے پانچ

۱۔ بحوالہ حیات جاوید ، مولوی الطاف حسین حالی ، مطبوعہ اکادمی پنجاب ۱۹۵۷ ، ص ۱۹۴

ملین ہندو تھے ۔ اس مردم شماری میں سوائے لاہور ڈویژن کے ، باقی ہر جگہ سکھوں کا شمار ہندوؤں میں کیا گیا تھا ۔ لاہور ڈویژن میں ، جہاں سکھ بتعداد کثیر آباد تھے ، ان کی علیحدہ گنتی ہوئی اور اس ڈویژن کی کل آبادی تین ملین (تیس لاکھ) میں سکھوں کی تعداد صرف دو لاکھ نکلی ۔ پنجاب کی آبادی زیادہ تر دیہات اور قصبات میں پھیلی ہوئی تھی جن کی تعداد چھبیس ہزار کے قریب تھی ۔ پچاس ہزار سے اوپر آبادی والے شہر صرف چار تھے جن کی آبادی حوالہ بالا مردم شماری کے مطابق ۱۸۵۴ء - ۱۸۵۵ء میں یہ تھی[1]

امرتسر	ایک لاکھ بائیس ہزار
لاہور	چورانوے ہزار
ملتان	چھپن ہزار
پشاور	ترپن ہزار

ابتدائے عہد انگلیسی کے ان اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ پنجاب کی کثیر آبادی دیہات اور چھوٹے چھوٹے قصبات میں بود و باش رکھتی تھی اور ان کی معیشت کا دار و مدار زراعت پر تھا ۔ یہ دیہاتی آبادی سادہ زندگی بسر کرتی تھی اور اپنی بیشتر ضروریات میں خود کفیل تھی ۔ شہروں کی طرف انھیں بہت کم رخ کرنا پڑتا تھا ۔ عرس ، تہوار ، موسمی میلے ٹھیلے ان کی اہم تفریحات تھیں ۔ امن ، چین کی زندگی گزارنا ان کا معمول اور سادگی ، بے تکلفی ، جفا کشی ، محنت ان کے نمایاں اوصاف تھے جو صدیوں کی روایت کو اپنے دامن میں لیے ہوئے تھے ۔ سکھوں کے دور کی بدامنی نے انھیں حالات پر شاکر رہنے کے علاوہ توہم پرست بھی بنا دیا تھا - انگلیسی عہد کے ساتھ انھیں پھر پرامن ماحول میسر آیا اور اس ماحول میں وہ اپنی روایت کے مطابق زندگی بسر کرنے لگے ۔ سابقہ زمانے میں پنچائتی نظام کی وجہ سے وہ اپنے جھگڑے مقامی طور پر طے کرلیتے تھے۔ نئے دور میں بھی کچھ عرصے تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن نئے عدالتی نظام کے آنے سے رفتہ رفتہ انھیں شہروں کی طرف آنا پڑا ۔

انگلیسی استعمار کے استحکام کے لیے اس خطے کی بڑی اہمیت تھی ۔ یہاں کا زرعی خام مال (اناج ، کپاس وغیرہ) انگلستان کی صنعتوں کے لیے اور یہاں کے جوانوں کا گرم خون برطانوی سلطنت کے دفاع کے لیے بہت سودمند تھا ۔ اس لیے یہاں انگریزوں نے خاص حکمت عملی اختیار کی جس میں یہاں کی مختلف قوموں کی حفاظت و سرپرستی

---

۱ - یہ اعداد و شمار ایس - ایس تھاربرن آئی - سی - ایس کی تصنیف ''دی پنجاب ان پیس اینڈ وار'' مطبوعہ ۱۹۰۴ء سے لیے گئے ہیں ۔

کے علاوہ اپنے استعماری مفادات کی حفاظت کا عزم بھی شامل تھا ۔ اتفاق سے انگریز سکھ راج کے ظلم و ستم کو ختم کر کے یہاں فاتحانہ شان سے آئے تھے اور پھر انھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے امن و امان قائم کر کے تعمیری کاموں کی طرف توجہ کی ۔ اس لیے لوگ انھیں اپنا نجات دہندہ سمجھنے کے ساتھ ساتھ ان سے خائف بھی تھے ۔ شروع میں سول سروس کے ارکان کی تعداد بہت کم تھی ۔ بعض اضلاع کے لیے صرف ایک ڈپٹی کمشنر میسر تھا جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ، ڈسٹرکٹ جج ، کلکٹر ، صدر ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ کے فرائض تنہا انجام دیتا تھا لیکن اس انگریز ڈپٹی کمشنر کا رعب و دبدبہ پورے ضلع پر ہوتا تھا ۔ انتظامیہ اور عدلیہ کا یہ ملغوبہ ایک ہی ذات میں ایک عرصے تک چلتا رہا ۔ انگریز سول سروس کے ارکان صاحبوں کی صورت اپنی رعایا سے الگ تھلگ بھی رہتے تھے اور اپنے محکوموں کے مسائل کو سمجھنے کے علاوہ ان پر کڑی نگاہ بھی رکھتے تھے ۔ مذہبی معاملات میں بھی انھوں نے اپنے آپ کو سب سے الگ تھلگ رکھا اور بظاہر یہاں کی تینوں قوموں (مسلم ، ہندو ، سکھ) سے یکساں سلوک کرنے کو اپنی پالیسی کا جزو بنایا تاکہ ان کے اپنے مفادات پر کوئی زد نہ پڑے ۔ اور یہ قومیں آپس میں الجھیں بھی تو ثالثی کے لیے صاحب بہادر ہی کی طرف رجوع کریں ۔ حقیقت میں یہ پالیسی یہاں کے حالات کے مطابق بڑی ہوشیاری اور دور اندیشی سے بنائی گئی تھی اور سامراج کے استحکام کے لیے کلیدی حیثیت رکھتی تھی ۔

اقتصادی لحاظ سے انگلیسی عہد میں پنجاب میں بڑی دور رس تبدیلیاں ہوئیں ۔ نہروں کے جاری ہونے سے بے آب و گیاہ زمینیں سرسبز و شاداب ہونے لگیں ۔ باری دوآب اور رچنا دوآب میں زرعی آبادکاری کا نیا سلسلہ شروع ہوگیا ۔ زراعت کی ترقی سے جہاں برطانوی مصنوعات کے لیے خام مال سستے داموں دستیاب ہونے لگا وہاں کاشتکاروں کے لیے خوشحالی کا راستہ بھی کھلا اور ان کے لیے کچھ نئے مسائل بھی پیدا ہوئے ۔ کئی سال تک زمینوں کا بندوبست عارضی رکھا گیا اور مالیانہ و آبیانہ نقد وصول کرنے کا طریقہ رائج کیا گیا ۔ حکومت کی تین چوتھائی آمدنی مالیے سے ہوتی تھی ۔ یہ طریقہ کاشتکاروں کے لیے نیا ہونے کے علاوہ تکلیف دہ بھی تھا ۔ پہلے وہ اجناس کی صورت میں مالیہ بھی دیتے تھے اور اپنی بیشتر ضروریات بھی اسی طرح مقامی طور پر پوری کر لیتے تھے ۔ اب انھیں دیگر ضروریات زندگی کے علاوہ بیج خریدنے اور مالیہ و آبیانہ ادا کرنے کے لیے نقد رقم کی ضرورت تھی اور اس کے لیے انھیں بنیے اور ساہوکار دست نگر ہونا پڑتا ۔ ایک بار ساہوکار کا مقروض ہونے کے بعد سود در سود کا چکر ان کے پاؤں میں ایسا پڑ جاتا تھا جس سے نکلنے کی کوئی صورت زمینوں

کو رہن رکھنے کے سوا نظر نہ آتی تھی - پھر حکومت رفاہی کاموں (تعلیم وغیرہ) کے لیے بھی مالیہ پر محصول (cess) لگا کر کاشتکاروں ہی کو مزید زیر بار کرتی رہی - مقروض کاشتکار کی محنت کا حاصل (اجناس) ساہوکار کے پاس اونے پونے ہو کر منڈیوں میں پہنچ جاتا اور وہاں سے آگے دساور کو سپلائی ہو جاتا یا بازاروں میں آ جاتا - کاشتکار خالی کا خالی ہاتھ رہ کر باقی وقت قوت لایموت کی تلاش میں گزارتا - قحط سالی کا سارا وبال بھی اسی پر پڑتا (پنجاب میں ۱۸۶۰-۶۱ء، ۱۸۷۷-۷۸ء، ۱۸۹۶-۹۷ء، ۱۸۹۹ء میں قحط سالی رہی) نئے عدالتی نظام نے ضبطی و قرقی کا مشینی عمل جاری کر کے کاشتکار کو گھر بار اور زمینوں سے بھی محروم کرنا شروع کر دیا - یہ دور انگریزی سنگینوں کے سائے میں درحقیقت "ساہوکار کا راج" تھا جس میں پنجاب کی زراعت پیشہ آبادی بہت کٹھن صورت حال کا سامنا کرتی رہی - ایس-ایس تھاربرن کے لفظوں میں :

> "Statistically, the Punjab might be the richest country, yet its people the poorest, in India, if they were the rack-rented tenants of capitalists. That is the condition towards which our "system" was, until 1900, reducing the "finest peasantry in India."[1]

۱۹۰۰ء میں قانون انتقال اراضی (The Punjab Land Alienation Act) بنا جس کی رو سے غیر کاشتکار طبقوں کے لیے زرعی زمین کے حصول پر پابندی لگی اور ساہوکار کے ہاتھوں زمیندار طبقے کے استحصال کا ایک دروازہ بند ہوا -

پنجاب میں یو-پی کی طرح بڑے بڑے جاگیردار (تعلقہ دار) تو بہت تھوڑے تھے لیکن انگریزوں کی پالیسی نے بڑے بڑے زمیندار پیدا کرنے میں خاص حصہ لیا - کچھ لوگ اوقاف کی زمینوں پر قابض تھے ، کچھ لوگوں کو ۱۸۵۷ء کی خدمات کے صلے میں نو آباد زمینوں میں وسیع رقبے ملے ، بعض لوگوں کو گھوڑی پال سکیم کے تحت مربعے عطا کیے گئے - ان بڑے زمین داروں کے علاوہ چھوٹے زمین داروں میں نمبرداری اور ذیل داری سسٹم کے ذریعے حکومت نے ایک اچھا خاصا اپنے جاں نثاروں کا گروہ پیدا کر لیا جس میں مسلمان اور سکھ دونوں شامل تھے - یہ مراعات یافتہ طبقہ حکومت اور دیہاتی عوام میں رابطہ پیدا کرنے کے لیے اہم خدمات سر انجام دیتا تھا اور بوقت ضرورت افسروں کے لیے بیگار اور حکومت کے لیے رنگروٹ فراہم کرنا اس کی ذمہ داری تھی - اس امر کا خاص خیال رکھا گیا کہ پنجاب کی معیشت سراسر زرعی بنیادوں پر قائم رہے اور کاشتکار و زمیندار ساہوکار کے دست نگر اور حکومت کے مطیع و فرمانبردار ہو کر استعماری نظام کے استحکام کا باعث بنیں - پنجاب کو تعلیمی اور سیاسی لحاظ سے ایک عرصے تک پس ماندہ رکھ کر ، اور حکومت کی

1. *The Punjab in War and Peace*, Page 256.

حمایت میں ایک متوسط درجے کا مراعات یافتہ طبقہ پیدا کرکے ان مقاصد کو تقویت پہنچائی گئی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب سامراج کی بقا کے لیے رنگروٹوں کی ایک منڈی بن گیا اور برطانوی سلطنت میں اسے بازوے شمشیر زن کا سا رعب اعزاز حاصل ہوگیا۔

بمبئی ، مدراس اور کلکتہ میں ۱۸۵۷ء میں یونیورسٹیاں قائم کر دی گئیں لیکن پنجاب میں صرف ضلعی مقامات پر ثانوی مدارس قائم کیے گئے۔ پنجاب کا پہلا گورنمنٹ کالج لاہور میں ۱۸۶۴ء میں قائم کیا گیا جسے کلکتہ یونیورسٹی سے الحاق کرنا پڑا ۔ حالانکہ کلکتہ یونیورسٹی کے مقاصد اور نصابات اس علاقے کے احوال و ضروریات سے بہت مختلف تھے ۔ یہی حال حکومتی اداروں کا تھا ۔ انڈین کونسلز ایکٹ ۱۸۶۱ء کے مطابق سب سے پہلے بمبئی اور مدراس میں صوبائی قانون ساز مجالس قائم کی گئیں ۔ پھر بنگال میں (۱۸۶۳ء) اور یو۔پی میں (۱۸۶۶ء) قائم ہوئیں ، اور سب سے آخر میں چھتیس سال بعد ۱۸۹۷ء میں پنجاب میں صوبائی کونسل بنائی گئی ۔ لیکن اس میں بھی یہ فرق ملحوظ رکھا گیا کہ جہاں دوسرے صوبوں کی کونسلوں میں نامزد نمائندوں کے ساتھ منتخب نمائندے بھی شامل تھے وہاں پنجاب میں تمام ممبروں کو (جن کی تعداد نو تھی) حکومت نامزد کرتی تھی ۔ پنجاب چونکہ تعلیمی لحاظ سے باقی صوبوں کے مقابلے میں بہت پس ماندہ تھا ، اس لیے انگلیسی عہد کے شروع میں یہاں سول سروس کے دیسی ارکان بھی زیادہ تر بنگال سے آتے تھے۔ حتیٰ کہ کچہریوں میں وکلا بھی زیادہ تر بنگالی ہوتے تھے۔ سکولوں میں کئی استاد بھی بنگالی تھے۔ اسی طرح اکثر ملازمتوں میں دہلی اور نواح دہلی کے باشندوں کا بھی دلی اور لاہور کے انتظامی طور پر ایک ڈھانچے کے سبب تناسب کسی قدر زیادہ تھا ۔ جس کی بنا پر حکومت برطانیہ نے جلد ہی مقامی اور غیر مقامی کے درمیان توازن کا ایک فارمولا بھی وضع کر لیا[۱] یہی حال سیاسی اداروں کے قیام کا تھا ۔ مغرب کے نئے افکار و خیالات کا نفوذ سب سے پہلے بمبئی، مدراس ، بنگال وغیرہ میں ہوا اور یہیں سے ان سیاسی و جمہوری تنظیموں کا سلسلہ شروع ہوا جو آگے چل کر ملک گیر صورت اختیار کر گیا ۔ بنگال ہی میں سب سے پہلے نیشنل انڈین ایسوسی ایشن قائم ہوئی جس کی شاخ ۱۸۷۷ء میں ایک بنگالی رہنما سندر ناتھ بینرجی نے پنجاب میں آ کر قائم کی ۔ لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ لاہور میں اس انجمن کے کرتا دھرتا بھی دو بنگالی بابو ہی تھے۔ اتفاق

۱- پندرہ روز ''سفیر پنجاب'' نے ۶ اکتوبر ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں یہ فارمولا درج کیا ہے :

''صاحبان بورڈ رائے دیتے ہیں کہ جہاں تحصیلدار ہندوستانی ہو وہاں پیشکار پنجابی مقرر ہوا کرے اور عہدہ جات تھانیداری و جمعداری و اظہار نویسی و نیز قانونگوئی و محرری پر پنجابی مقرر کیے جاویں'' ۔

بحوالہ ''روح صحافت'' امداد صابری ، صفحہ ۲۸۵

سے اسی سال (۱۸۷۷ء) کلکتہ میں سید امیر علی نے بھی نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی جو مسلمانوں کی پہلی سیاسی تنظیم تھی - اس کی شاخ بعد میں پنجاب میں بھی قائم ہوئی - ۱۸۸۵ء میں بمبئی میں انڈین نیشنل کانگرس کا قیام عمل میں آیا - کانگرس کی بنا مسٹر اے - او ہیوم نے وائسرائے ہند لارڈ رپن کے مشورے سے رکھی جس کا مقصد حکومت اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں خوشگوار تعلقات استوار کرنے کے علاوہ ملک کے مختلف و متصادم عناصر کو متحد کرکے ایک قوم بنانا تھا - مغربی نیشنلزم کا یہ تصور نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے بڑا پرکشش تھا - پنجاب میں بھی کانگرس کی شاخ ۱۸۸۵ء ہی میں قائم ہوگئی - لیکن اس کا دائرۂ عمل بھی چند تعلیم یافتہ افراد تک محدود تھا - البتہ پنجاب کے ہندوؤں میں اس زمانے میں سوامی دیانند سرسوتی کی آریہ ساجی تحریک جو اس نے گجرات کاٹھیاواڑ سے یہاں آکر شروع کی (۱۸۷۵ء) بہت مقبول ہوئی - دوسری طرف مسلمان سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک سے متاثر تھے اور جب سرسید (دو بار ۱۸۷۳ء اور ۱۸۸۴ء میں) پنجاب میں آئے تو متوسط طبقے کے مسلمانوں نے ان کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور علی گڑھ کالج کے لیے خطیر رقمیں چندے کے طور پر دیں - غرض اس زمانے میں جو سیاسی، تعلیمی یا معاشرتی تحریکیں ملک میں اپنے سفر کا آغاز کر رہی تھیں ان کے رہنما پنجاب کو بھی اپنی جولانگاہ بنا رہے تھے اور ''زندہ دلان پنجاب'' ہر تیز رو کے ساتھ تھوڑی دور چل کر بیٹھ جاتے اور افق مغرب سے ابھرنے والی شفق خوں رنگ کا نظارہ کرنے لگتے - خود پنجاب کے اندر تعلیمی، معاشرتی اور معاشی سرگرمیوں کا آغاز کسی مقامی رہنما کی بجائے انگریز حکام کی سرپرستی میں ہوا - انجمن پنجاب کا قیام اور اس کے کارنامے اس لحاظ سے خاص اہمیت کے حامل ہیں -

انجمن پنجاب کی بنا ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو لاہور میں دیسی امرا (جن میں ہندو، مسلم، سکھ شامل تھے) اور یورپین افسروں کے ایک مشترکہ اجلاس میں رکھی گئی - ڈاکٹر جی۔ڈبلیو لائٹنر پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور، جو نئے نئے ولایت سے آئے تھے، اس کے محرک تھے - انجمن کے اغراض و مقاصد یہ قرار پائے:

(۱) قدیم مشرقی علوم کا احیا و ترقی، آثار قدیمہ، تاریخ، لسانیات اور معاشرتی علوم پر تحقیق کی حوصلہ افزائی -

(۲) دیسی زبانوں کے ذریعے عوام میں علوم مفیدہ (سائنس وغیرہ) کی اشاعت -

(۳) صنعت و تجارت کے فروغ میں کوشش کرنا -

(۴) علمی، ادبی، معاشرتی اور عام سیاسی دلچسپی کے مسائل پر تبادلۂ خیال کرنا، حکومت کے تعمیری اقدامات کو مقبول بنانا، ملک میں وفاداری اور مشترکہ ریاست کی شہریت کے احساس کو فروغ دینا اور عوام الناس کی خواہشات اور مطالبات کے مطابق حکومت کو تجاویز پیش کرنا -

(۵) مفاد عامہ کے اقدامات میں صوبے کے تعلیم یافتہ اور با اثر طبقوں کو حکومت کے افسروں کے قریب تر لانا ۔

انجمن پنجاب اپنے پر جوش و با عمل صدر ڈاکٹر لائٹنر کی رہنمائی میں بہت جلد ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی ۔ مختلف شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں ۔ مذکورہ بالا مقاصد کی پیش رفت کے لیے متعدد کمیٹیاں بنائی گئیں ۔ لاہور میں ایک کتب خانہ و دارالمطالعہ قائم کیا گیا ۔ ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا گیا ۔ ہفتہ وار علمی مجالس کا انعقاد باقاعدگی سے ہونے لگا جہاں مختلف علمی و ادبی موضوعات پر مضامین پڑھے جاتے اور ان پر بحث ہوتی ۔ انجمن پنجاب نے اپنے قیام کے پہلے برس ہی پنجاب میں علوم مشرق کی ایک یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی اور اس کے لیے سرگرم عمل ہوگئی ۔ اسی سال سر ڈانلڈ میکاوڈ پنجاب کے لیفٹننٹ گورنر مقرر ہوئے تھے ۔ وہ ایک پرجوش عیسائی تھے لیکن مسیحیت کے فروغ کے لیے طاقت کی بجائے حکمت اور تبلیغ کے قائل تھے ۔ اس لیے انہوں نے تعلیمی اداروں کی طرف خصوصی توجہ دی ۔ ان کا خیال تھا کہ ”جتنا زیادہ ہم دیسی باشندوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے ، ان کے جذبات و احساسات اور امنگوں کے بارے میں مشورہ کریں گے اور انھیں اعتماد میں لیں گے اتنا ہی ہم نسلی تفاوت اور حاکم و محکوم کے فاصلے کو کم کرنے میں کامیاب ہوں گے ۔“[۱] سر ڈانلڈ میکاوڈ نے ۱۰ جون ۱۸۶۵ء کو ڈائریکٹر تعلیم پنجاب کو ایک مراسلہ بھیجا اور دیسی زبانوں کی ترقی اور ان میں مغربی علوم و فنون جذب کرنے کے سلسلے میں تجاویز طلب کیں ۔ ڈاکٹر لائٹنر نے اس مراسلے کی روشنی میں اگست ۱۸۶۵ء میں انجمن پنجاب کی طرف سے لاہور میں ایک اجلاس بلایا جس میں امرتسر و لاہور کے چیدہ چیدہ امرا و علما مشورے کے لیے جمع ہوئے ۔ اس اجتماع کے سامنے ڈاکٹر لائٹنر نے یہ تجویز رکھی :

”مدنظر یہ ہے کہ سلف کی مشرقی تعلیم کو از سر نو جاری کیا جائے جس سے زبان ہائے دیسی کی تکمیل ہو سکے ۔ اس لیے یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ لاہور میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے جس کا کام یہ ہو کہ انشا وغیرہ میں وہ سب سے اعلیٰ بیت العلوم ہو اور علوم مشرق اور علوم مروجہ میں امتحان اور تعلیم کیا کرے ، اور جو اسباب تعلیم کے فی الحال موجود ہیں ان کو استعمال میں لا کر واجب طور پر وسعت دیوے ۔ زبان ہائے مشرق تعلیم کی بنیاد ہوں اور ان زبانوں کے ذریعے سے یورپ کے علوم کی تعلیم ہو اور ہر ایک شخص اس تجویز کی کامیابی کے لیے کوشش و سعی کرے“[۲]۔

---

1. Edward Lake, *Sir Donald Mcleod*, Page 123.

۲۔ دستور العمل پنجاب یونیورسٹی کالج (سال ۱۸۷۴ء-۱۸۷۵ء) ص ۷ ۔

رکانے اجلاس نے ڈاکٹر لائٹنر سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے انھیں مجوزہ یونیورسٹی کا منصوبہ پیش کرنے کے لیے کہا ۔ یہ منصوبہ ۱۱ ستمبر ۱۸۶۵ء کے اجلاس میں منظوری کے لیے پیش کیا گیا ۔ اس منصوبے میں مندرجہ ذیل تجاویز شامل تھیں :

(۱) ایک سینیٹ اور افسران یونیورسٹی مقرر ہوں ۔

(۲) ایک علمی کمیٹی مقرر کی جائے جس کا کام یہ ہوگا کہ انگریزی کتب درسی کو منتخب کر کے ان کا ترجمہ دیسی زبانوں میں کرے اور زبان ہائے مشرق کی تعلیم کو باقاعدگی سے جاری کرے ۔

(۳) ایک کمیٹی واسطے زبان ہائے مشرق کے مقرر ہو جس کا کام یہ ہو کہ عربی و فارسی و سنسکرت کی باقاعدہ تعلیم کرائے اور ان زبانوں میں بڑے بڑے شاعروں اور مورخوں کی کتابیں طبع کروائے اور زبان و علوم مشرق کا کتب خانہ قائم کرنے اور بڑھانے میں مدد اور سعی کرے ۔

(۴) عربی ، فارسی ، سنسکرت ، اردو ، ہندی اور کوئی مضمون علمی یا زبان مشرق میں امتحان کرنے کی تجویز ہوئی ۔[1]

ان تجاویز کو منصوبے کی صورت میں پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر لائٹنر نے کہا کہ ''اس یونیورسٹی کے قیام سے اس خطے میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگا جس میں علم و فن کا ماحصل تمام لوگوں کی دسترس میں ہوگا ۔''

یہ منصوبہ حکومت کو ارسال کر دیا گیا ۔ پھر اس منصوبے کی تائید میں امرتسر اور لاہور کے ۶۵ سر کردہ افراد کے دستخطوں سے ایک محضر تیار کر کے لیفٹننٹ گورنر کی خدمت میں پیش کیا گیا ۔ دیسی اکابر کی ان مساعی کو تقویت پہنچانے کے لیے یورپین حضرات (مسٹر برانڈرتھ ، کمشنر ، مسٹر سی-یو ایچی سن ، ڈپٹی کمشنر ، مسٹر الیگزانڈر ، انسپکٹر آف سکولز ، مسٹر لیپل گریفن) پر مشتمل ایک تائیدی کمیٹی بنائی گئی ۔ اس طرح دیسی امرا اور بدیسی حکام نے مل کر مجوزہ یونیورسٹی کے لیے سرمایہ فراہم کرنے اور زمین ہموار کرنے کا کام شروع کیا ۔ انجمن پنجاب کی اس تعلیمی تحریک سے متاثر ہو کر یو - پی کی برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے بھی اگست ۱۸۶۷ء میں (سرسید کی سرکردگی میں) دیسی زبانوں کی یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے وائسرائے کی خدمت میں عرضداشت بھیجی ۔ انجمن پنجاب اور برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے مطالبات میں یہ فرق تھا کہ انجمن کلاسیکی زبانوں (عربی ، فارسی سنسکرت) اور علوم کے احیاء و ترقی کے ساتھ ساتھ جدید مغربی علوم کو دیسی

۱- دستور العمل پنجاب یونیورسٹی کالج (سال ۱۸۷۴ء-۱۸۷۵ء) ص ۸ ۔

زبانوں میں پڑھانے کا مطالبہ کر رہی تھی جبکہ ایسوسی ایشن صرف دیسی زبانوں میں جدید مغربی علوم پڑھانے کے حق میں تھی ۔ کچھ عرصے کے بعد ایسوسی ایشن (یا اس کے بانی سرسید احمد خان) اپنے اس مطالبے سے بھی دست بردار ہوگئی اور ان انگریز ماہرین تعلیم کی موئید بن گئی جو لارڈ میکالے کی قرارداد کے مطابق انگریزی ذریعہٴ تعلیم کے حق میں تھے ۔ انجمن پنجاب کی جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۷۰ء میں پنجاب میں ایک یونیورسٹی کالج قائم ہوگیا، اور ۱۸۸۲ء میں یہاں مکمل یونیورسٹی کا قیام عمل میں آ گیا ۔ بمبئی ، مدراس اور کلکتہ کے بعد یہ برصغیر کی چوتھی یونیورسٹی تھی ۔ اس یونیورسٹی کے مقاصد میں انجمن پنجاب کی بعض تجاویز کو جزوی طور پر شامل کیا گیا ۔ کلاسیکی زبانوں کی تحقیق اور دیسی زبانوں کے فروغ کے لیے اورینٹل کالج قائم رہا اور جدید مغربی علوم کے لیے انگریزی کو ذریعہٴ تعلیم بنا دیا گیا ۔ اس طرح اہل پنجاب کی اشک شوئی بھی ہوگئی اور میکالے کے تعلیمی نظریے کا بھی بول بالا ہوگیا ۔

یونیورسٹی کی تحریک کے علاوہ انجمن پنجاب نے معاشی، معاشرتی اور ثقافتی امور کے سلسلے میں بھی بہت سی خدمات سر انجام دیں ۔ انجمن نے ”عوامی مفاد یا انسانی ہمدردی کے مقاصد کے لیے کثیر سرمایہ فراہم کیا ۔ ۱۸۶۵ء سے پنجاب پر اثر انداز ہونے والے تمام اہم اقدامات سے اس کا خاص رابطہ رہا اور اس ضمن میں حکومت کو متواتر مشورے دیے گئے ۔ انجمن نے کئی صنعتی نمائشوں کا اہتمام کیا ۔“ (رپورٹ ۱۸۸۱-۱۸۸۲ء) اردو ادبیات کی تواریخ میں مئی ۱۸۷۵ء سے منعقد ہونے والے ماہوار موضوعاتی مشاعروں کا خصوصی ذکر آتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہاں سے جدید اردو شاعری کا آغاز ہوا ۔ دراصل یہ مشاعرے محکمہٴ تعلیم کے ایما پر نصابی ضرورتوں کے پیش نظر شروع کیے گئے تھے اور اپنے اس مقصد کو حاصل کر کے ایک سال کے اندر ختم ہوگئے ۔ تاہم انجمن پنجاب کی مشاعرہ کمیٹی نے مشاعروں کے وقتاً فوقتاً انعقاد اور نئی نظموں اور غزلوں کی طباعت و اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا ۔ ان شعری اجتماعات کا مقصد یہ تھا کہ ”عشق و محبت کے موضوعات اور کسی حکمران کی تعریف پر مشتمل شاعری سے قطع نظر نظمیں کہنے اور ان کے ترجمہ کرنے کی حوصلہ افزائی کی جائے ۔ تاہم ان موضوعات کو بالکل نظر انداز بھی نہ کیا جائے“ (رپورٹ ۱۸۸۱-۱۸۸۲ء)

انجمن پنجاب کلاسیکی زبانوں کی تحقیق و تدریس کے علاوہ جدید زبانوں (اردو ، ہندی ، پنجابی) کی ترقی کے لیے بھی کوشاں تھی ۔ اس معاملے میں انجمن کا موقف وہی تھا جو حکومتی سطح پر انگریز حکام کا تھا کہ اختلافی امور سے پہلوتہی کر کے تینوں قوموں کے مفادات کا خیال رکھا جائے ۔ لیکن اردو ، ہندی تنازعے کے اثرات

دوسرے علاقوں سے رفتہ رفتہ پنجاب میں پہنچ رہے تھے - ۱۸۸۱ء میں ہنٹر تعلیمی کمیشن کے سامنے پنجاب کے ہندوؤں نے بڑے زور شور سے سکولوں میں ناگری ہندی کے نفاذ کا مطالبہ رکھا - اس کا ردعمل مسلمانوں میں بھی ہوا ، اور وہ اردو کے لیے سینہ سپر ہوگئے - سکھوں نے گورمکھی پنجابی کا نعرہ لگایا - انجمن اس نزاعی مسئلے کے باوصف اردو ، ہندی اور پنجابی تینوں زبانوں کی سرپرستی کر رہی تھی- انجمن پنجاب نے ۱۸۸۲-۱۸۸۳ء میں ان زبانوں کی ترویج کے لیے جو کمیٹیاں قائم کیں ان کے ارکان کے ناموں پر ایک نظر ڈالنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا:

اردو کمیٹی :

۱- مولوی فیض الحسن
۲- رائے کنھیا لال
۳- نواب نوازش علی
۴- نواب غلام محبوب سبحانی
۵- ڈاکٹر جی-ڈبلیو لائٹنر
۶- ای ڈبلیو پارکر
۷- ڈاکٹر رحیم خاں
۸- پیرزادہ محمد حسین
۹- پنڈت امرناتھ
۱۰- خان بہادر منشی محمد لطیف
۱۱- مولوی ابوسعید محمد حسین
۱۲- سوڈی حکم سنگھ
۱۳- پنڈت ایشری پرشاد
۱۴- سردار گوردیال سنگھ
۱۵- وزیراعظم مہدی خاں
۱۶- چیف جسٹس غلام نبی
۱۷- میر نثار علی

ہندی کمیٹی :

۱- بابو نوبن چندر رائے
۲- پنڈت گورو پرشاد
۳- پنڈت سکھ دیال
۴- پنڈت رشی کیش
۵- بھائی گورمکھ سنگھ
۶- پنڈت ایشری پرشاد
۷- پنڈت بھان دت

پنجابی کمیٹی :

۱- سردار عطر سنگھ
۲- سردار ٹھاکر سندھاں والیہ
۳- سوڈی حکم سنگھ
۴- بھائی میاں سنگھ
۵- لالہ بہاری لال
۶- ریورنڈ ڈاکٹر وائٹ بریخٹ
۷- بھائی پرسہ سنگھ
۸- رائے مول سنگھ
۹- بھائی گورمکھ سنگھ
۱۰- بھائی چرت سنگھ
۱۱- بابو نوبن چندر رائے
۱۲- جوگی شیو ناتھ

ناموں کی اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اردو کمیٹی کا حلقہ وسیع بھی ہے اور اس میں پنجاب کی تینوں قوموں کے نمائندے بھی شامل ہیں۔ جبکہ ناگری ہندی اور گورمکھی پنجابی کی کمیٹیوں میں صرف ہندوؤں اور سکھوں کے نام ملتے ہیں یا ایک آدھ انگریز کا۔ ہر چندکہ ہندو اس زمانے میں ہندی بھاشا کے نفاذ کے لیے محضر اور وفود بھیج کر اور جلسے کر کے ماحول کو تلخ بنا رہے تھے لیکن عملاً پنجاب میں تعلیم، صحافت اور خطابت میں اردو ہی کا بول بالا تھا۔ کیونکہ یہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں کی تحریر و تقریر کی زبان اردو تھی، ان پڑھ عوام بھی اسے سمجھتے تھے۔ پنجابی صرف بول چال کی زبان تھی اور ہندی بھاشا نہ بول چال کی زبان تھی، نہ تحریر و تقریر کی، بلکہ صرف اکتسابی زبان تھی جس کی تعلیم و ترویج پر ہندو جاتی اپنا سارا زور صرف کر رہی تھی۔ یہ صورت حال خود اس امر کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ پنجاب کی حد تک زبان کے مشترکہ سرمائے کو کون ٹھکرا رہا تھا اور اختلاف کے بیج کون بو رہا تھا!

۱۸۵۷ء کے انقلاب نے دہلی و لکھنؤ کے تہذیبی مرکزوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ خصوصاً سقوط دہلی کے بعد یہاں کی مسلمان آبادی کو شہر بدر کر دیا گیا۔ یہاں سے اجڑنے والوں نے دوسرے مقامات کا رخ کیا۔ پنجاب ان پناہ گزینوں کے لیے نسبتاً قریب بھی تھا اور یہاں کا ماحول اس عرصے میں پر سکون بھی رہا تھا۔ اس لیے اکثر لوگ پنجاب کے مختلف شہروں میں پناہ گزین ہوئے۔ کشمیر میں ڈوگرہ راج کی سختیوں کی وجہ سے اکثر کشمیری خاندان بھی پنجاب میں آ کر آباد ہو رہے تھے۔ سیالکوٹ، وزیر آباد، گجرات، گوجرانوالہ، لاہور، امرتسر میں کشمیریوں کی کافی آبادی ہو گئی۔ اپنے گھر بار چھوڑ کر آنے والوں کے لیے پنجاب کا وسیع ماحول اور لوگوں کی کشادہ دلی تالیف قلب کا باعث تھی اور یہ لوگ یہاں کے ماحول میں رس بس گئے۔ امرتسر ایک تجارتی مرکز کے طور پر اور لاہور علمی و ادبی مرکز کے طور پر عہد انگلیسی میں خصوصی اہمیت حاصل کرتے جا رہے تھے۔ چنانچہ دہلی و لکھنؤ کے بعد لاہور اردو زبان و ادب کے فروغ کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ انجمن پنجاب کی تحریک اس اعتبار سے اس عہد کی بڑی ہمہ گیر تحریک تھی۔ علمی، ادبی، تعلیمی اور لسانی طور پر اس انجمن نے لاہور کو مرکز بنا کر مختلف شہروں میں شاخیں قائم کیں اور کتب خانے، اخبار جاری کرنے کے علاوہ ادبی و شعری اجتماعات کی طرح ڈالی۔ مقامی باشندے ان تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے تھے اور انگریز حکام بھی ان سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ جہاں دہلی و لکھنؤ کے مہاجر ادیب و شاعر موجود تھے وہاں وہ بھی ان تقریبات میں حصہ لیتے اور جو تہذیبی شمع ۱۸۵۷ء کی باد صرصر سے دہلی و لکھنؤ میں بجھ رہی تھی، اسے لاہور اور دوسرے شہروں میں فروزاں کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

لاہور کا بازار حکیماں (اندرون بھاٹی دروازہ) ادبی و ثقافتی سرگرمیوں میں خاص شہرت حاصل کر گیا تھا ۔ اوریئنٹل کالج اور گورنمنٹ کالج کے کئی استاد یہیں بود و باش رکھتے تھے ۔ اکثر امرا و شرفا کی حویلیاں اس علاقے میں تھیں جو علم و ادب سے دلچسپی رکھتے تھے ۔ ان کی سرپرستی میں یہ علاقہ لاہور کا ''چیلسی'' بن گیا تھا ۔[1]

لاہور کا پہلا چھاپہ خانہ مطبع کوہ نور منشی ہر سکھ دیو نے ۱۸۵۰ء میں قائم کیا اور یہاں سے پہلا اردو ہفتہ وار ''کوہ نور'' جاری کیا ۔ اس کے بعد لاہور میں بہت سے چھاپے خانے قائم ہوئے اور اکثر چھاپہ خانوں کے ساتھ ہفتہ وار یا سہ روزہ اخبارات جاری ہوئے ۔[2]

۱۔ حکیم احمد شجاع مرحوم نے ''لاہور کا چیلسی'' کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین لکھ کر بازار حکیماں کی ادبی مجلسوں کا تذکرہ کیا ہے ۔ ''چیلسی'' لندن کے اس علاقے کا نام ہے جہاں نامور انگریز ادیب بود و باش رکھتے تھے ۔

۲۔ لاہور کے چھاپہ خانوں اور اخبارات کی یہ فہرست ملاحظہ فرمائیے : پنجابی مطبع (بانی منشی محمد عظیم) ہفتہ وار ''پنجابی اخبار'' ۔ مطبع انجمن (پنجاب) ہفتہ وار اخبار ''انجمن''۔ مطبع آفتاب (بانی دیوان بوٹا سنگھ) اخبار ''آفتاب'' سہ روزہ (مدیر مولوی فقیر محمد) مطبع متر بلاس (بانی بال مکند) چہار روزہ ''اخبار عام'' جسے پیسہ اخبار بھی کہتے تھے ، بقول کنہیا لال ''اس اخبار کے مضامین عمدہ ہوتے تھے ۔'' (تاریخ پنجاب ، صفحہ ۴۴) ۔ مطبع سیفی (بانی سید نادر علی شاہ سیفی) ہفت روزہ ''رہبر ہند'' و ''خزینۃ القوانین'' ۔ مطبع لاہور پنچ ''اخبار لاہور پنچ'' ۔ وکٹوریہ پریس (بانی منشی عزیزالدین) ہفتہ وار ''شفیق ہند'' اور روزنامہ ''شام وصال'' اور ''نسیم صبح'' (مدیر سیف الحق سیف) وکٹوریہ پریس میں چھپتے تھے مطبع دہلی پنچ (فضل الدین) ہفتہ وار اخبار ''دہلی پنچ'' ۔ مطبع البرٹ گزٹ (خواجہ احمد حسن) ہفتہ وار ''البرٹ گزٹ'' مطبع خورشید عالم (منشی جگن ناتھ) ہفتہ وار خورشید عالم ۔ مطبع مفید عام (منشی گلاب سنگھ) ہفتہ وار ''ریفارمر'' (مطبع آریہ پریس اور مطبع براہم سماج میں چھپتا رہا) مطبع رفیق ہند (مولوی محرم علی چشتی) ہفتہ وار ''رفیق ہند'' مطبع گلشن رشیدی (مولوی فضل دین) ہفتہ وار ''ہدایت'' ۔ مطبع گلزار محمدی ، ہفتہ وار ''خیر خواہ کشمیر'' (مدیر پنڈت سالگ رام کول) نیو امپیریل پریس ہفتہ وار ''آئینہ اخلاق'' (مدیر عبدالعزیز) مطبع مصطفائی (امیرالدین) مطبع قانونی (پنڈت سورج بھان) پیسہ اخبار لاہور (اجرا ۱۸۸۷ء) یہ فہرست مکمل نہیں ۔ محکمہ تعلیم پنجاب کا مطبع اور مطبع سول اینڈ ملٹری گزٹ وغیرہ اس کے علاوہ ہیں ۔ (بحوالہ ''تاریخ پنجاب'' از کنہیا لال و ''تاریخ صحافت'' و ''روح صحافت'' از امداد صابری)

انیسویں صدی کے ربع آخر میں پنجاب کی فضا مذہبی اختلافات کی بنا پر بہت تلخ ہو گئی تھی۔ اسباب کچھ تو تاریخی تھے اور کچھ نئے دور کے اقتصادی و معاشرتی حالات اس کے ذمے دار تھے ۔ سکھ راج میں مسلمانوں پر جو مظالم ہوئے ان سے مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان اختلاف کا ایک جذبہ موجود تھا ۔ ہندو اور سکھ مذہبی ، معاشرتی معاملات میں مختلف تھے لیکن مسلم دشمنی میں دونوں متحد تھے ۔ الحاق پنجاب کے بعد انگریز حکمرانوں نے ان اختلافات میں بظاہر غیر جانب داری اور سب سے رواداراند اور مساویانہ سلوک کا مسلک اختیار کیا لیکن درپردہ اپنی کل ہند پالیسی کے تحت ہندوؤں اور سکھوں کی سرپرستی کو اپنا شعار بنایا اور اس علاقے کی مسلم اکثریت کو دوہرے ستم کا نشانہ بنائے رکھا ۔ برصغیر میں انگریزی غلبے کے ساتھ ہی ہندو نے سامراج کے ساتھ سمجھوتہ کر کے تعلیم اور اقتصاد کے میدانوں میں آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا ۔ اس کے برعکس مسلمان تصادم کی راہ اختیار کر کے تعلیمی اداروں اور اقتصادی میدانوں سے محروم ہوتے چلے گئے ۔ ۱۸۱۷ء میں کلکتے میں پہلا ہندو کالج قائم ہوا ۔ مسلمانوں نے ٹھیک ساٹھ سال بعد ایم-اے-او کالج علی گڑھ میں قائم کیا ۔ گویا وہ تعلیم میں نصف صدی سے بھی زیادہ ہندوؤں سے پیچھے رہ گئے تھے ۔ یہی صورت سرکاری ملازمتوں میں پیش آئی ۔ نئی حکومت کے انتظامی اداروں میں تعلیم یافتہ ہندو ہر جگہ چھا رہے تھے اور مسلمان یہاں بھی غائب تھے ۔ ہندوؤں کی پیش قدمی اور مسلمانوں کی پسپائی کی یہ داستان بڑھتے بڑھتے پنجاب تک آئی تو مسلم اکثریت کے اس صوبے میں بھی مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی ۔ کاشت کار اور محنت کش مسلمان تھے لیکن ہندو بنیے اور ساہوکار کاروباری مرکزوں اور منڈیوں میں چھائے ہوئے تھے اور دفتروں اور عدالتوں میں بھی براجمان تھے ۔ نہ صرف مجسٹریٹ ہندو تھے بلکہ اکثر وکلا بھی ہندو ہی ہوتے تھے ۔ مسلمان کاشتکار سود در سود کے چکر میں پھنس کر قرقی و ضبطی کے مرحلے تک پہنچتا تھا تو عدالتوں میں ہندو وکیل اور ہندو منصف، ہندو ساہوکار کی پشت پناہی کے لیے موجود تھے ۔ انگریز کے قانونی شکنجے اور سنگینوں کے سائے میں مسلمان اپنی زرعی زمینوں اور گھربار سے بھی ہاتھ دھو رہے تھے ۔ ان حالات میں تلخی بڑھتی جا رہی تھی ۔ سامراجی حکمران غیر جانب داری ، رواداری ، رعایا پروری اور عدل و انصاف کا چولا پہن کر اس جبر کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ہندو اس موقع سے ہر جگہ پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ برطانوی سامراج کی آغوش میں ایک نیا سامراج پل رہا تھا اور دونوں کا ہدف برصغیر کے مسلمان تھے۔ مسلمانوں کے گزشتہ دور حکمرانی کا سیاسی انتقام لینے کا منصوبہ منظر عام پر آ رہا تھا۔ بنگال میں رام موہن رائے کی برہمو سماج بھی ایک احیائی تحریک تھی لیکن اپنے زمانے کے حالات کے لحاظ سے نسبتاً اعتدال کے دائرے میں تھی ۔ لیکن پنجاب میں آریہ سماج کی تحریک ویدک دھرم کے احیاء و

ملیے کا تصور لے کر اٹھی تو اس نے اسلام پر رکیک حملے کرکے اور قدم قدم پر مسلم دشمنی کو اپنا مسلک بنا کر مذہبی کشیدگی کو انتہا تک پہنچا دیا ۔ آریہ سماج تحریک کا بانی دیانند سرسوتی گجرات (کاٹھیاواڑ) کا رہنے والا تھا ۔ پنجاب کی سرزمین کو اپنی جارحانہ و متشددانہ تحریک کے لیے زرخیز پا کر یہاں آیا اور اس شدت کے ساتھ شہروں اور دیہاتوں میں اسلام ، بانی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہریلا پرچار شروع کیا کہ خفتہ حال مسلمانوں کو بھی اپنی مدافعت کے لیے میدان میں نکلنا پڑا ۔ جگہ جگہ مباحثے اور مناظرے ہونے لگے ۔ عیسائی مشنریوں کے بعد آریہ سماجیوں کی پیدا کردہ اس مناظرانہ فضا کے باعث پنجاب میں مذہبی فضا تلخ اور ناخوشگوار صورت اختیار کرنے لگی ۔ گئو رکھشا اور ناگری ہندی کے نام پر جا بجا سبھائیں قائم ہو گئیں ۔ سکھوں نے بھی سنگھ سبھائیں بنا کر ہندوؤں کی تقلید شروع کی ۔ مختلف شہروں میں مسلمانوں نے بھی اپنے دفاع اور قومی فلاح و بہبود کے لیے انجمنیں بنائیں ۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کی بنا ۱۸۸۴ء میں ڈالی گئی ۔ اردو ہندی تنازعے اور میونسپل کمیٹیوں کے انتخابات نے ۱۸۸۱ء کے بعد فضا کو اتنا زہر آلود کر دیا کہ برصغیر کے دوسرے علاقوں کی بہ نسبت پنجاب میں ہندو مسلم کشیدگی تشویشناک صورت اختیار کر گئی ۔ ۱۸۸۳ء اور ۱۸۹۱ء کے درمیانی عرصے میں معمولی مقامی جھگڑوں کے علاوہ پنجاب میں پندرہ بڑے بڑے فسادات ہوئے اور اپنے پیچھے کدورت کا غبار چھوڑ گئے ۔ ان حالات میں سامراجی حکمرانوں کو بھی اپنی بے لچک غیر جانب دارانہ حکمت عملی پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ کیونکہ جو لاوا پنجاب میں پک رہا تھا وہ کسی وقت بھی مہلک صورت اختیار کر سکتا تھا اور اس میں استعمار کی ناؤ بھی ڈوب سکتی تھی ۔ میونسپل کمیٹیوں کے انتخابات میں جداگانہ نیابت، ملازمتوں میں مسلمانوں کی اشک شوئی اور زرعی زمینوں پر بنیوں ، ساہوکاروں اور غیر کاشتکاروں کے بڑھتے ہوئے دباؤ کو کم کرنا خود سامراجی حکمرانوں کے اپنے مفاد کے لیے ضروری ہوگیا تھا ۔ فرنگی افواج اور پولیس میں پنجابی مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہو چکی تھی اور برطانوی سلطنت کو جو خطرات در پیش تھے ان میں سامراج کو اپنی بقا کے لیے ان مسلمان جوانوں کے خون کی ضرورت تھی ۔ اندریں حالات تعلیم و اقتصاد میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی کو دور کرنا بہت ضروری ہوگیا تھا ۔ جس طرح سرحدی علاقوں کی صورت حال نے ۱۸۷۰ء میں وائسرائے ہند لارڈ میو کو مسلمانوں کے بارے میں برطانوی پالیسی پر نظرثانی کے لیے مجبور کیا تھا ، کم و بیش اسی طرح کے حالات کے تحت بیس سال بعد پنجاب میں بھی انگریزوں کو اپنی حکمت عملی کے تبدیل کرنے کا احساس پیدا ہوا ۔ کافی عرصے تک نئی پالیسی کے اختیار کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا گیا ۔ سامراجی حکمرانوں کا وقار ، رعب اور بالادستی کا احساس

فوری عملدرآمد کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا ۔ بالآخر زرعی زمینوں کی منتقلی کو روکنے کا قانون بنایا گیا اور ملازمتوں میں مسلمانوں کے خلا کو دور کرکے پنجاب کی مختلف قوموں کے درمیان توازن پیدا کرنے کی نئی حکمت عملی قدم پھونک پھونک کر اختیار کی گئی ۔ اس حکمت عملی نے انتہا پسند ہندو قوم پرستوں کو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے خلاف بھی صف آرا کردیا ۔ پنجاب میں لالہ لاجپت رائے ہندو قوم پرستی کی اسی لہر کے نمائندے بن کر ابھرے ۔

انیسویں صدی کے ربع آخر میں پنجاب کی یہ غبار آلود فضا مستقبل کے سیاسی افق پر تمہید بن کر چھا رہی تھی ۔ جدید مغربی تعلیم و افکار کے ساتھ نیا قومی و سیاسی شعور جنم لے رہا تھا ۔ پنجاب کی نوجوان تعلیم یافتہ نسل بھی انیسویں صدی کے ختم ہونے کے ساتھ اس شعور و احساس سے بہرہ ور ہوکر میدان عمل میں نکل رہی تھی ۔

اس دور کے کشیدہ ماحول میں انجمن پنجاب جیسی معتدل تعلیمی و ادبی تحریک بھی آخر دم توڑ گئی ۔ تاہم علم و ادب کے میدان میں اس تحریک نے جو روایت قائم کی تھی ، وہ نئے حالات کے ساتھ آگے بڑھتی رہی ۔ اورینٹل کالج انجمن پنجاب کی آخری یادگار کے طور پر باقی رہ گیا اور اس کی حیثیت بھی روز بروز بدلتی جا رہی تھی ۔ آریہ سماج نے اپنے تعلیمی ادارے قائم کیے اور ہندو عصبیت کے فروغ اور تربیت کے لیے اخبارات بھی جاری کیے ۔ مسلمانوں نے انجمن حمایت اسلام کے ذریعے اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے شروع کیے ، اور سکھوں نے بھی اپنی انفرادیت کا بھرم قائم رکھتے ہوئے ان کی تقلید میں قدم آگے بڑھائے ۔ اس طرح پنجاب میں ہندو ، مسلم ، سکھ بنیادوں پر قومی تعلیمی اداروں کا قیام انجمن پنجاب کی مشترکہ تعلیمی تحریک پر غالب آنے لگا ۔ اس سے قبل پنجاب کے چند بڑے شہروں میں حکومت ، والیان ریاست اور عیسائی مشنریوں نے کالج بنائے تھے[۱] ۔ ۱۸۸۸ء میں لاہور میں ڈی ۔ اے ۔ وی (دیانند اینگلو ویدک) کالج قائم ہوا جو آریہ سماج تحریک کا علمی مرکز بنا ۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کا اسلامیہ کالج ۱۸۹۲ء میں قائم ہوا ۔ خالصہ کالج امرتسر ۱۸۹۶ء میں اور ہندو کالج دہلی ۱۸۹۹ء میں قائم ہوئے ۔ علیحدہ علیحدہ قومی تعلیمی اداروں کے قیام سے جہاں اعلیٰ تعلیم کے رجحان میں جذبہ

---

۱ ۔ گورنمنٹ کالج لاہور (۱۸۶۴ء) ، فارمن کرسچین کالج لاہور (۱۸۶۶ء ، تین سال بعد پرنسپل ہنری کے انتقال کے بعد بند ہوگیا اور دوبارہ ۱۸۸۶ء میں کھلا) سینٹ سٹیفنز کالج دہلی (۱۸۸۲ء) ، مہندرا کالج پٹیالہ (۱۸۸۰ء) صادق ایجرٹن کالج بہاولپور (۱۸۸۲ء) میونسپل بورڈ کالج امرتسر (۱۸۸۸ء) ، سکاچ مشن کالج سیالکوٹ (۱۸۸۹ء) ، رندھیر کالج کپور تھلہ (۱۸۹۶ء)

مسابقت کی بدولت ترقی ہوئی وہاں ہندو ، مسلم ، سکھ اقوام کے درمیان اختلافات کی خلیج بھی وسیع سے وسیع تر ہونے لگی -

دیسی باشندوں کی یہ مخالفانہ صف آرائی ایک لحاظ سے فرنگی استعمار کے لیے مفید بھی تھی ، کیونکہ ثالث بالخیر کی حیثیت سے ''صاحب'' کی پوزیشن مضبوط ہو رہی تھی - وکٹورین عہد کا سامراجی مزاج اپنی شفقت اور ہیبت کی متضاد خصوصیات کے ساتھ مقامی باشندوں کے لیے حیرت انگیز تھا - انگریز حکمران اپنے دفتروں ، عدالتوں اور کچہریوں میں رعایا کے لیے مہربان 'مائی باپ' کا درجہ رکھتے تھے اور اپنی الگ بستیوں (کنٹونمنٹ اور سول لائنز ایریا) اور کلبوں ، ہوٹلوں اور تفریح گاہوں میں جا کر حکمران قوم کا لبادہ پہن لیتے اور کوئی دوسری ہی مخلوق بن کر ہیبت کا نمونہ بن جاتے تھے - لاہور کا لارنس گارڈن اسی لیے اس زمانے میں دیسی باشندوں کے لیے شجر ممنوع کی حیثیت رکھتا تھا اور ہائی کورٹ کے پاس شاہراہ مال پر پنجاب کے پہلے لیفٹننٹ گورنر سرجان لارنس کا مجسمہ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قلم پکڑے محکوم پنجابیوں سے اس تحکمانہ لہجے میں مخاطب تھا :

"By which will you be governed ?"

بیسویں صدی کی سیاسی بیداری کے بعد اگرچہ یہ الفاظ یوں بدل دیے گئے تھے :

"I served you with pen and sword !"

لیکن الفاظ سخت ہوں یا نرم ، ان کا استعماری مفہوم ایک ہی تھا اور انیسویں صدی کے نصف آخر کا پنجاب اسی مفہوم کی تاریخی تعبیر تھا -